شہر تمنّا

علی احمد جلیلی

ناشر

یونیورسل بک اسٹال چوک حیدرآباد ۲

اے۔ پی

پہلی بار : ایک ہزار
سنہ اشاعت : ۱۹۷۷ء
بہ تعاون اُردو اکیڈمی۔ آندھرا پردیش
خوش نویس: محمد ضمیر الدین نظامی
قیمت : دس روپے

●

مِلنے کے پتے

اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش سیف آباد۔ حیدرآباد۔۲
جلیل منزل۔ محلہ سلطان پورہ۔ حیدرآباد ۲۴
دفتر تعمیر ہفتہ وار، محبوب نگر (اے پی)

مطبوعہ:
دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد
سرورق: انتخاب پریس

غزلیں

ترتیب

نظمیں

غزلیں

گفتنی

بیا ور ید گر اینجا بود زباں دانے
غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

میری غزلیات کا پہلا مجموعہ "نقش قدم" سات سال پہلے طبع ہوا تھا۔ اس پہلے مجموعہ سے دوسرے مجموعہ "شہر تمنا" تک مَیں نے کوئی لمبا سفر طے نہیں کیا ہے پھر بھی اس عرصہ میں میری غزل کے لہجہ اور فکر و اسلوب میں کچھ نئے موڑ آ گئے ہیں۔ صنفِ غزل میں بالخصوص آج جس تیزی سے رد و بدل ہو رہا ہے اور داخلی و خارجی طور پر نت نئے تجربے جو اس میں کئے جا رہے ہیں اس نے غزل کی پوزیشن بہت نازک کر دی ہے۔ ایک طرف نئے ڈکشن کا رجحان ہے جس نے غزل کو ایسے الفاظ سے بوجھل کرنا شروع کر دیا ہے جو اس کے مزاج سے قطعی میل نہیں کھاتے۔ دوسری طرف "کُھردری غزل" اور "آزاد غزل" کے تجربے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ انھیں ابتک قبول عام نہیں ملا ہے۔ میں متوازی قدم رکھنے کا عادی ہوں۔ آرٹ کی سطح پر جلد بازی کا قائل نہیں۔ نتیجہ یہ کہ پہلا مجموعہ "نقش قدم" جب شائع ہوا اور ایک جدید نقاد کے ہاتھ میں تبصرہ کیلئے پہنچا تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے ایک طرف رکھ دیا کہ یہ تو روایتی شاعری ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ جدید ذہن غزل میں غزل کے علاوہ اور سب کچھ ڈھونڈنے کا عادی ہے اور میں غزل کو صحافت یا اشتہار کی صف میں لا کر کھڑا کرنا نہیں چاہتا۔

مَیں مانتا ہوں کہ آج کے شاعر کو پہلے شاعروں سے ذہنی طور پر مختلف ہونا چاہیئے کیونکہ بھوک کی تپش سے جب جسم پگھلتا ہو تو شبنم و گل کی لطافت کی باتیں نہیں کہی جا سکتیں۔ مجھے غزل کی روایتی فرسودگی کا پورا احساس ہے۔ قدیم دبستان سے قریبی وابستگی کے باوجود روایت پرستی کو میں نے کبھی مستحسن نہیں سمجھا ہے۔ قدامت کی جگہ جدت یقیناً قابلِ تعریف ہے لیکن میرے سامنے غزل کا ماضی بھی ہے۔ اسکی روایت بھی اور اسکے امکانات بھی۔ روایت کو برتنا اور روایت سے کام لینا دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ نیا پن پُرانے پن کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ من و سلویٰ کی طرح آسمان سے نازل نہیں ہو جاتا۔ اس پس منظر میں مَیں جدید شاعر نہیں ہوں۔ جدید عہد کا شاعر ہوں چنانچہ میں نے عصری حسیت کو بھی اپنے شعروں میں غزل کی آرائش خم کاکل کے ساتھ نظم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں جو نیا پن داخل کیا ہے اُسے نئے اسلوب کی دین سمجھتا ہوں۔ شاعری کا معاملہ یہ ہے کہ وہ تاج محل بھی ہو سکتی ہے اور ٹوٹی ہوئی قبر بھی۔ سوال صرف برتنے کے سلیقہ کا ہے۔

جہاں تک غزل کی رمزی علامتوں کا تعلق ہے میں یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ الفاظ اور امیجری کی بھی عمر ہوتی ہے۔ میں مثبت انداز میں سوچتا اور سمجھتا ہوں کہ ان کے فنکارانہ استعمال سے نئی دشائیں کھولی جا سکتی

ہیں۔ بشرطیکہ الفاظ کو جذبہ کی شکل میں محسوس کیا جائے۔ نئی زبان بنانے یا نئے الفاظ کو غزل میں داخل کرنے کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کا انتخاب ایسا ہونا ضروری ہے کہ وہ غزل کے مزاج اور آہنگ کو برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

ایک بحث شاعری میں شخصیت و مقصدیت کی ہے۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ غزل کی شاعری میں مقصدیت کا عنصر کم ہونا چاہیئے۔ یہ بات دوسری ہے کہ صنف غزل کو مقصدی شاعری کیلئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور اسکی آواز میں زوال خوردہ معاشرہ کی چیخیں بھی شامل کی جاسکتی ہیں کیونکہ اپنی ذات یا شخصیت کو باقی دنیا سے الگ رکھ کر سوچنا ممکن نہیں۔ تاہم کسی مقصد یا نظریہ کی پابندی خود اپنے اوپر عائد کرلینا غزل کو اسکی شعریت سے محروم کرنا ہے۔

"شہر تمنّا" کی ترتیب میں مَیں نے پہلے ان غزلوں کو جگہ دی ہے جو بعد میں کہی گئی ہیں اور جن کا سلسلہ حال سے ملتا ہے۔ پہلے کہی ہوئی غزلیں آخر میں ہیں۔ ان دونوں کے رنگ و آہنگ میں جو فرق ہے اس میں فصل قائم رکھنے کیلئے درمیان میں نظمیں دیدی گئی ہیں۔ یہ نظمیں ان نظموں میں سے چند ہیں جنھیں علٰحدہ مجموعہ کی صورت دیجارہی ہے۔

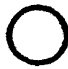
مجھے دیانت داری کے ساتھ یہ اعتراف ہے کہ میں نے اپنی طویل ادبی زندگی میں جو کچھ لکھا اپنی شعری صلاحیتوں کے اعلان کیلئے نہیں بلکہ اپنے جذبہ کی تسکین کیلئے لکھا۔ تحسین و ستائش کی تمنا مجھے کبھی نہیں ہوئی۔ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ مَیں شاعر ہوں۔

مَیں جناب علی سردار جعفری اور جناب محمود سعیدی کا بیحد شکر گذار ہوں کہ انھوں نے میرے کلام پر اپنی رائے کا اظہار فرمایا۔

علی احمد جلیلی

جلیل منزل۔ سلطان پورہ
حیدرآباد ۲۴
آندھرا پردیش

غزلیں



یہ کارِ شیشہ گری ہے نہیں ہے سنگ زنی

کیا کسی شہرِ تمنا کی حدیں آپہنچیں
خوبصورت ہے ہر اک موڑ نگاروں کی طرح



روکے سے کہاں حادثۂ وقت رُکا ہے
شعلوں سے بچا شہر تو شبنم سے جلا ہے

کمرہ کسی مانوس سی خوشبو سے بسا ہے
جیسے کوئی اُٹھ کر ابھی بستر سے گیا ہے

یہ بات الگ ہے کہ مَیں جیتا ہوں ابھی تک
ہونے کو تو سو بار مرا قتل ہوا ہے

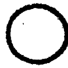
تھاما تھا جسے شیشہ و کافور سمجھ کر
ہاتھوں سے وہی چھوٹ کے پتھر پہ گرا ہے

رودادِ چراغاں تو بہت خوب ہے لیکن
یہ بھی تو کہو کس کا لہو اس میں جلا ہے

پھولوں نے چرا لی ہیں مجھے دیکھ کے آنکھیں
کانٹوں نے بہت دور سے پہچان لیا ہے

ہر شخص ہے ہاتھوں میں صلیب اپنی اٹھائے
جینا ہی مرے دور میں جینے کی سزا ہے

اس رنگِ تغزل پہ علیؔ چھاپ ہے میری
یہ ذوقِ سخن مجھ کو وراثت میں ملا ہے



جب کبھی حد سے بڑھیں تنہائیاں
آگئیں نزدیک کچھ پرچھائیاں

پھول چننے کا سلیقہ چاہیئے
لوگ کر لیتے ہیں زخمی انگلیاں

یار رہا ہم پاس ان کے بیٹھ کر
ناپتے ہیں قربتوں کی دوریاں

شبنم و گل کا تصدق دوستو
اس طرف بھی ایک دو چنگاریاں

رنگ تھا وہ یا ہمارا ننھا لہو
آپ نے کھیلی ہیں جس سے ہولیاں

بیچ دی ہم نے قلم کی آبرو
ہائے رے فنکار کی مجبوریاں

کیوں اندھیرے اے علیؔ بدنام ہیں
چاندنی میں بھی ہوئی ہیں چوریاں





خشک ہونٹوں پہ تبسم کی کرن ہو جیسے
ریگزاروں میں گلابوں کا چلن ہو جیسے

اس تکلف سے انہیں ہاتھ لگاتا ہے خیال
کوئی ترشا ہوا شیشے کا بدن ہو جیسے

سمٹی سمٹائی ہوئی اپنی ہی پہنائی میں
زندگی بھی مرے بستر کی شکن ہو جیسے

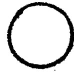
جھینے کپڑوں کی تہوں میں یہ سراپا تیرا
بادلوں میں کوئی ملفوف کرن ہو جیسے

آج بھی زخم کی صورت مرے دل کے قریب
میٹھی میٹھی تری یادوں کی چبھن ہو جیسے

رات چہرے پہ صلیبوں کی لگائے ہوئے دھول
صبح اوڑھے ہوئے میلا سا کفن ہو جیسے

اُف یہ انداز تری ٹوٹتی انگڑائی کا
اس میں شامل مرے خوابوں کی تھکن ہو جیسے

ہو گئے جس کے روایات علی خواب و خیال
اب بھی آنکھوں میں وہ تصویر دکن ہو جیسے



زخم کا رشتہ تبسم سے ملا لیتے ہیں لوگ
بارِ غم اب اس سلیقہ سے اٹھا لیتے ہیں لوگ

ظلمتِ شب حد سے بڑھتی ہے تو گھبرا کر کبھی
شمع کے دھوکے میں دل اپنا جلا لیتے ہیں لوگ

آج تیرے شہر میں قاتل کی ہے وہ آبرو
دامنوں پر خون کے دھبے لگا لیتے ہیں لوگ

تیری زلفوں کی عنایت تیرے آنچل کا کرم
زندگی کی دھوپ کو سایہ بنا لیتے ہیں لوگ

آگ سے جو کھیلتے ہیں بات ان کی چھوڑیے
شبنم و گل سے بھی ہاتھ اپنے جلا لیتے ہیں لوگ

لطف گلچینی سے کم پتھراؤ کی لذت نہیں
پھول جب ملتے نہیں پتھر اٹھا لیتے ہیں لوگ

کل ترستا تھا زمانہ تیرے دامن کیلئے
آج تیرے ہاتھ سے دامن چھڑا لیتے ہیں لوگ

کون کس کا درد بانٹے ہے علی اس دور میں
اپنی لاش اپنے ہی کاندھوں پر اٹھا لیتے ہیں لوگ



ہے زندگی کا گرد سے چہرہ اٹا ہوا
جیسے کوئی غریب مسافر تھکا ہوا

زحمت نہ ہو تو آپ کے دامن میں ڈال دوں
آنکھوں میں رہ گیا ہے اک آنسو بچا ہوا

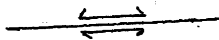
کچھ بات ہے ضرور کہ لٹنے کے باوجود
اب تک ہوں ہر نگاہ کا مرکز بنا ہوا

رکھتا ہوں ہر قدم پہ قدم احتیاط سے
رستے میں کون ہے یہ بکھر کر پڑا ہوا

ہونٹوں پہ برگِ گل سے نچوڑی ہوئی ہنسی
عارض میں آفتاب ہو جیسے پِسا ہوا

زلفوں کے خم میں رات کا دم توڑتا خمار
آنچل کی سلوٹوں میں سویرا لٹکا ہوا

کل تک علیؔ میں سر سے قدم تک تھا روشنی
ہوں آج اپنے جسم کا سایا بنا ہوا



ہنگامۂ حیات سے جب واسطا پڑا
ہر حادثے سے اپنا پتہ پوچھنا پڑا



رات کے بڑھتے اندھیروں کو سزا دی جائے
تو ذرا دل کے چراغوں کی بڑھا دی جائے

کیا اسی واسطے سینچا تھا لہو سے اپنے
جب سنور جائے چمن آگ لگا دی جائے

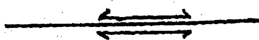
دور تک دل میں دکھائی نہیں دیتا کوئی
ایسے ویرانے میں اب کس کو صدا دی جائے

اپنے لٹنے کا یہ احساس تو باقی نہ رہے
کیوں نہ یہ ہوش کی دیوار گرا دی جائے

تبصرہ بعد میں بھی قتل پہ ہو سکتا ہے
پہلے یہ لاش تو رستے سے ہٹا دی جائے

عقل کا حکم کہ ساحل سے لگا دو کشتی
دل کا اصرار کہ طوفان سے لڑا دی جائے

مصلحت اب تو اسی میں نظر آتی ہے علی
کہ ہنسی آئے تو اشکوں میں بہا دی جائے



وقت کے ہاتھوں نے ہم کو کیا دیا
چھین کر بینائی آئینا دیا



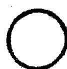
نہ جانے کونسی منزل پہ لیکے آیا ہے
وہ نقشِ پا جو تمناؤں نے بنایا ہے

ابھی ابھی جو گیا ہے قریب سے اٹھ کر
وہ آدمی نہیں اک آدمی کا سایا ہے

غریبِ شہر کے ہاتھ اور کچھ تو کیا آتا
تمہارے شہر سے پتھر اٹھا کے لایا ہے

تمہارے جسم کی ویرانیوں سے کیا مجھ کو
مرے خیال کا صحرا سجا سجایا ہے

شفق جہاں سے سلگتے بدن کی پھوٹی ہے
دھنک میں رنگ کا طوفان وہیں سے آیا ہے



آپ چادر تان کر سوتے رہے
شہر میں بدنام ہم ہوتے رہے

زندگی اک رات تھی اور رات بھر
لاش ارمانوں کی ہم ڈھوتے رہے

کتنے گیسو آ کے میرے ہاتھ میں
پیچ و خم کا بانکپن کھوتے رہے

ساغروں میں تشنگی پلتی رہی
اور میخانے لہو روتے رہے

تجکو لفظوں میں سمونے کے لئے
پہلے ہم اُن کا بدن دھوتے رہے

آپ کو ہمراہ میرے دیکھ کر
حادثوں میں مشورے ہوتے رہے

جو کسی کے قتل میں شامل نہ تھے
وہ بھی دھبے خون کے دھوتے رہے

اشک ٹپکے ان کی آنکھوں سے علیؔ
میرے افسانے رقم ہوتے رہے



خوبصورت تھی یہ دنیا کبھی آنچل کی طرح
آج بے فیض ہے برسے ہوئے بادل کی طرح

اپنی ہی ذات میں بکھرا ہوا انسان ہے آج
فرشِ میخانہ پہ ٹوٹی ہوئی بوتل کی طرح

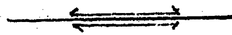
اپنی بھیگی ہوئی زلفوں کو نچوڑا اس نے
درد کی رات بھی جاتی ہے کاجل کی طرح

کتنے ڈوبے ہوئے سورج نکل آئے لیکن
اب بھی آنکھوں میں اندھیرا ہے وہی کل کی طرح

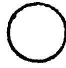
آپ سرکار نہ قاتل ہیں نہ خونی لیکن
شہر کیوں اپنا سجا رکھا ہے مقتل کی طرح

رقص ہم کرتے رہے پاؤں کی زنجیر کے ساتھ
اور زنجیر چھنکتی رہی پائل کی طرح

اپنا احسان ہے دنیا کے اندھیروں پہ علیؔ
ہم سلگتے رہے ہر دور میں مشعل کی طرح



تو سمندر ہے نہ بادل ہے نہ آس
پھر تجھے کیوں دیکھ کر بڑھتی ہے پیاس



پھونکوں سے بجھا ہوں نہ مٹانے سے مٹا ہوں
میں وقت ہوں تاریخ کے چہرے پہ لکھا ہوں

گھبرا کے چھڑایا تھا جہاں آپ نے دامن
اب تک اسی دیوار کے سایے میں کھڑا ہوں

چن بھی لیئے ہر اک نے مقاماتِ نشیمن
میں ہوں کہ ابھی شاخِ چمن ڈھونڈ رہا ہوں
دنیا ہے کہ پھولوں کی خوشامد میں لگی ہے
اک میں ہوں کہ کانٹوں میں لہو بانٹ رہا ہوں
آنچ آئی کسی پر نہ علی میری طرف سے
سلگا ہوں سلیقے سے قرینے سے بجھا ہوں

بڑھیں قافلے کیا تئے فکر و فن کے
کھڑی ہیں روایات دیوار بن کے

خیالوں کی بد صورتی کو چھپانے
لگا لائے چہرے گلاب و سمن کے

جو رکھتے تھے کل اپنی مٹھی میں سورج
وہ محتاج ہیں آج اک اک کرن کے

اندھیروں سے کر لی ہے سازش جنھوں نے
بجھا دو سب ایسے چراغ انجمن کے

چلے آؤ دنیا کی نظریں بچا کر
دبے پاؤں ایسے کہ پائل نہ چھنکے

سنبھل کر ذرا ہاتھ ان کو لگانا
کہیں ٹوٹ جائیں نہ شیشے بدن کے

جہاں بھی کسی جسم کا پھول مہکا
چلی آئی دنیا خریدار بن کے

علیؔ میکدہ ہے یہ فکر اور فن کا
یہاں ہوش اڑتے ہیں اہلِ سخن کے



محسوس کروں بدن کو تیرے
اتنا بھی نہ ہو قریب میرے

جا بیٹھی وہیں سمٹ کے غربت
کچھ سایے جہاں ملے گھنیرے

ظلمت کو صلیب پر چڑھانے
زینے سے اترتے ہیں سویرے

تنہائی کا خون کر کے شب بھر
جاتا ہے وہ کوئی منھ اندھیرے



حالات کے مرثیے ابھی تک
چہرے پہ لکھے ہوئے ہیں میرے
ہو جائے نہ رات ریزہ ریزہ
باہوں کے سمٹ رہے ہیں گھیرے
رخسار سے پھوٹتی شفق سی
آنچل میں سکے ہوئے سویرے
رہتا ہوں میں اس کے پاس گویا
تکیہ پہ لکھے ہیں شعر میرے
تاریخ ہیں دورِ حاضرہ کی
شبنم سے جلے ہوئے بسیرے



ہجومِ شوق میں اپنا کہیں پتا نہ ملا
وہ بھیڑ تھی کہ نکلنے کا راستا نہ ملا

رکے تو بڑھ گئے کچھ اور فاصلے جیسے
چلے تو چار قدم کا بھی فاصلہ نہ ملا

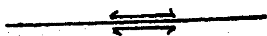
ہر ایک پھول پہ تھی چھاپ باغبانوں کی
ہمارے خوں کا چھینٹا کہیں ذرا نہ ملا

کلی کی طرح چٹک کر خموش ہو جاتے
ہمیں تو اتنا تبسم بھی اے صبا نہ ملا

سبک خرام تھے ایسے بہار کے جھونکے
گزر گئے تو کہیں ان کا نقش پا نہ ملا

تری گلی کی سیاست عجب نظر آئی
کہیں سے کوئی دریچہ کھلا ہوا نہ ملا

نقاب اتار کے رکھ دے علی جو چہرے سے
ہمیں تو کوئی کہیں ایسا آئینا نہ ملا



کسی آذر کسی تیشے سے سنوارا نہ گیا
سنگِ دل میرا کسی شکل میں ڈھالا نہ گیا



دل کو چھو کر کون یہ گزرا
تم تھے یا خوشبو کا جھونکا

اس کا آنچل میلا میلا
کس افسانے کا ہے ٹکڑا

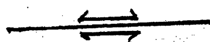
جلتا گھر تو سب نے دیکھا
کون جلا یہ کس نے پوچھا

جھانک رہا ہے ہمسائے سے
ایک بدن کچھ سمٹا سمٹا

کس کس کو خون اپنا بانٹوں
ہر اک جیسے خون کا پیاسا

رستے سب سنسان پڑے ہیں
اک پھرتا ہے قاتل تنہا

اس کا روپ عجب کیا کہیے
جیسے کوئی گیت کا مکھڑا



سانولے رُخ پہ بال بکھرے تھے
مَیں یہ سمجھا دھواں ہے شام



ہنگامۂ نشاط نہ طوفانِ حادثات
سونی پڑی ہے حدِ نظر تک رہِ حیات

رفتار کیا ہے وقت کی یہ ہم سے پوچھئے
چلتے ہیں لیکے ہاتھ میں ہم نبضِ کائنات

اک عمر ساتھ رہتے ہوئے ہو گئی مگر
پہچانتی نہیں ہے ابھی تک مجھے حیات

چہرے کی ہر لکیر ہے تحریر درد کی
دل کا ہر ایک زخم ہے عنوانِ واردات

سورج ابھر چکا بھی، سحر بھی ہوئی مگر
بستر کی ہر شکن سے ابھی جھانکتی ہے رات

شیشے سے بھی سوا ہیں نزاکت میں اے علی
مرمر کے پیکروں میں تراشے تخیلات



پھول برسے کبھی ہر سمت سے پتھر آئے
حادثے روز نیا روپ بدل کر آئے

بات کیا ہے کہ بھٹکتا رہا جس راہ پہ مَیں
آپ بھی راہ بھٹک کر وہیں اکثر آئے

کھول دو بال تو جاتا ہوا ساون رک جائے
مُسکرا دو تو چمن دُور سے چل کر آئے

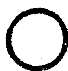
ہوں تو قطرہ ہی مگر ظرف کا عالم یہ ہے
تشنگی اپنی بجھانے کو سمندر آئے

دُور بھاگوں تو وہ سایہ کی طرح ساتھ رہے
راہ روکوں تو خیالوں سے گزر کر آئے

اور تو رہ گئے سب چھوٹ کے راہوں میں مگر
حادثے میرے تعاقب میں برابر آئے

بادلو تم کو برسنا تھا مرے کھیتوں پر
فائدہ کیا جو چٹانوں پہ برس کر آئے

اے علی درد کا رشتہ بھی عجب رشتہ ہے
چوٹ ان کو لگے زخم اپنے بدن پر آئے



فریبِ نکہت و گلزار سے بچاؤ مجھے
کرم کرو کسی صحرا میں چھوڑ آؤ مجھے

وہ جنس ہوں میں جسے بِک کے مدتیں گزریں
جو ہو سکے تو کہیں سے خرید لاؤ مجھے

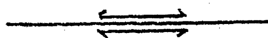
میں کون ہوں مجھے چہرہ بھی اپنا یاد نہیں
کہیں سے لا کے، کوئی آئینہ دکھاؤ مجھے

کسی پہ اپنے سوا اب نظر نہیں پڑتی
مری نگاہ سے اے دوستو چھپاؤ مجھے

مچل رہی ہے نظر چھو کے دیکھئے اُس کو
سمٹ رہا ہے بدن ہاتھ مت لگاؤ مجھے

وہ لاش راہ سے جس کو اُٹھا کے لائے ہو
کہیں وہ مَیں تو نہیں ہوں ذرا دکھاؤ مجھے

بکھر چکا ہوں علیؔ میں غزل کے شعروں میں
بساطِ عارض و لب سے سمیٹ لاؤ مجھے



تجھ سے ہرجائی کو لفظوں میں سمونے کیلئے
کتنے آوارہ خیالوں کو سمیٹا ہیں نے





رات بادل جو تری زلف کا پھیلا ہو گا
کون جانے ہے کہاں ٹوٹ کے برسا ہو گا

تیرے بخشے ہوئے زخموں کا عجب عالم ہے
اس لطافت سے کوئی پھول نہ مہکا ہو گا

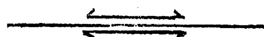
ساری دنیا پہ چھڑک دوں نہ اُجالے تو بھی
میری مٹھی میں کسی دن تو سویرا ہو گا

چھوڑیئے بات ہماری شبِ تنہائی کی
آپ کا دل بھی تو کچھ دیر کو دھڑکا ہو گا

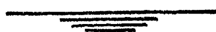
اپنے گلشن ہی میں مجرم کی طرح پھرتا ہوں
کیا خبر تھی کہ ہر اک پھول پہ پہرا ہوگا

جسکی بوندوں کو ترستے رہے گلشن اپنے
ریگزاروں پہ وہ بادل کہیں برسا ہوگا

اے علیؔ جسکی تباہی پہ ہنسے تھے ہم بھی
کیا خبر تھی کہ وہ اپنا ہی سفینا ہوگا



نظروں سے جب پڑھا تو گماں اور ہی ہوا
ہاتھوں سے جب چھُوا تو بدن تھا لہُو لہُو





ملی حیات تو ڈالے ہوئے نقاب ملی
کھلی ہوئی نہ کبھی ہم کو یہ کتاب ملی
تمہارے شہر کے وہ میکدے تھے یا مقتل
جہاں رگوں سے نچوڑی ہوئی شراب ملی
وہ یاد جس کو کہیں دور چھوڑ آئے تھے
پلٹ کے پیچھے جو دیکھا تو ہم رکاب ملی
جہاں سے لوگ اُجالے سمیٹ لائے تھے
ہمیں وہاں سے فقط گردِ آفتاب ملی

وہ آرزو جسے ہم ڈھونڈتے رہے برسوں
خیال و خواب کے سائے میں محوِ خواب ملی



کون اس سمت سے گزرا ہے شراروں کی طرح
رہگزر میری چمکتی ہے ستاروں کی طرح

کیا کسی شہرِ تمنّا کی حدیں آپہنچیں
خوبصورت ہے ہر اک موڑ نگاروں کی طرح

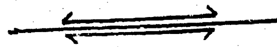
ہائے وہ جسم جو کل تک تھے غرورِ گلشن
آج پامال ہیں مسلے ہوئے ہاروں کی طرح

کاش طوفان ہی بن کر وہ اِدھر آنکلیں
ہم ہیں کھولے ہوئے آغوش کناروں کی طرح

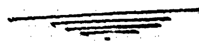
آج بھی درد کے صحرا میں بھٹکتی ہے حیات
پیچ و خم کھائی ہوئی راہ گزاروں کی طرح

کون اس دائرۂ شوق سے باہر نکلے
خواہشیں گھیر کے بیٹھی ہیں حصاروں کی طرح

نقشِ پا اپنے مٹانے سے عَلی مٹ نہ سکے
پھر اُبھر آئے ہیں ڈوبے ہوئے تاروں کی طرح



بادل کے انتظار میں کتنی اُداس ہے
وہ سرزمیں کہ دفن جہاں میری پیاس ہے





کون یہ آیا برافگندہ نقاب
بجھ گئے آنگن میں میرے آفتاب

دل تک اڑ کر اُس کے ذرے آئے ہیں
گر کے ٹوٹا ہے کہیں جامِ شراب

میرے ماتھے کا لکھا پڑھ لیجئے
میں ہوں خود اپنے سوالوں کا جواب

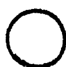
کونسے ہیں یہ مقاماتِ سفر
اپنا سایہ بھی نہیں ہے ہم رکاب

آئی ہے خوشبو تمہارے لمس کی
جب کبھی کھولی ہے پڑھنے کو کتاب

دیتے ہیں کل کی بہاروں کا پتہ
آج کے سوکھے ہوئے برگِ گلاب

وقت کے ہاتھوں نے بڑھ کر اے علیؔ
نوچ پھینکے کتنے چہروں کے نقاب

فرشِ گُل سے بھی یوں گزرتا ہوں
جیسے کانٹوں پہ پاؤں دھرتا ہوں



چاند سورج کی نگاہوں سے چھپاؤ مجکو
تیرگی ہوں میں اُجالے میں نہ لاؤ مجکو

کون ہوں کیا ہوں میں آئینہ دکھاؤ مجکو
مَیں بھی دیکھوں تو ذرا سامنے لاؤ مجکو

ٹوٹنے میں ہے جو لذّت وہ بکھرنے میں کہاں
فرشِ گل پر نہیں پتھر پہ گراؤ مجکو

خاک اڑائی تھی جہاں اہلِ چمن نے میری
لے چلو پھر وہیں اکبار ہواؤ مجکو

قتل گاہوں کی مجھے راہ دکھانے والو
پہلے الزام ہے کیا یہ تو بتاؤ مجکو

زخم سمٹے ہیں کہ رسوا نہ سرِ محفل ہوں
اشک مچلے ہیں کہ پلکوں پہ سجاؤ مجکو

آج ہر سر پہ لٹکتی ہوئی تلواریں ہیں
زندگی چیخ رہی ہے کہ بچاؤ مجکو

جو دکھاتے ہیں عملی سب کو نشانِ منزل
میں وہی نقش قدم ہوں نہ مٹاؤ مجکو



وہی ہے کل کے اندھیروں کا سامنا اب بھی
کہیں ہے جیسے اُجالا رُکا ہوا اب بھی

وہ بال کھولے کبھی اِس طرف سے گزرے تھے
مہک رہا ہے مرے دل کا راستا اب بھی

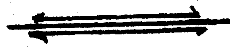
وہ آ گئے مری سانسوں سے بھی قریب مگر
دل و نگاہ میں باقی ہے فاصلا اب بھی

جہاں جہاں سے چلن آپ کے چراغوں کا
وہاں وہاں ہے اندھیرا بڑھا ہوا اب بھی

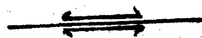
لبوں پہ عشرتِ امروز کی غزل لیکن
نظر میں دورِ گزشتہ کا مرثیا اب بھی

بجھا بجھا ہی سہی دلِ غریب کا لیکن
نہ جانے کتنے گھروں کا ہے یہ دِیا اب بھی

جس آئینے کو علیؔ توڑ کر میں نکلا تھا
قدم قدم پہ اسی کا ہے سامنا اب بھی



اب تو آنچل کی اوٹ سے بھی علیؔ
وقت کی دھوپ چھن کے آتی ہے





پیار کرتا ہوں میں سزا دیدو
مجکو جینے کی بد دعا دیدو

حادثے میری سمت آتے ہیں
دور ہٹ جاؤ راستا دیدو

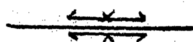
چھین لو مجھ سے یہ محل میرے
سانس لینے کو کچھ ہوا دیدو

تشنگی ہے ہماری صحرا کی
مے نہیں ہم کو میکدا دیدو

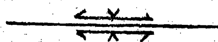
جھانکتے ہیں جو سب کے چہروں میں
ان کے ہاتھوں میں آئینا دیدو

چاند سورج تراشنے والو
ہم کو بھی روشنی ذرا دیدو

ہیں جو برتے ہوئے خیال علی
پیرہن اُن کو تم نیا دیدو



یہ جو سایوں میں آج جلتے ہیں
دھوپ سے ڈر کے بھاگ آئے تھے





ہے ترے شہر کی یہ رسم عجیب
سب کے ہاتھوں میں ہیں نشانِ صلیب

جیسے اپنا وجود کھو بیٹھے
پھول آ کر ترے بدن کے قریب

اُف یہ میرا جنونِ تشنہ لبی
یوں نہ آؤ شراب بن کے قریب

دل نے کھولی ہے آنکھ ظلمت میں
روشنی میں بھٹک نہ جائے غریب

اپنا چہرہ وہ کیسے پہچانیں
آئینے بھی جنہیں نہیں ہیں نصیب

جیسے ٹھہرا ہوا ہے ہر لمحہ
زندگی کا ہے یہ مقام عجیب

ہے بڑی چیز درد کا رشتہ
جس کو دیکھو وہی لگے ہے حبیب

لیجئے اے علی قدم بڑھکر
تیرگی لائے ہیں سحر کے نقیب



اشک کی بوند کو پلکوں پہ سجائے رکھئے
ہے غنیمت یہ چراغ اسکو جلائے رکھئے

کون مظلوم ہے اس شہر میں معلوم تو ہو
اپنے ہاتھوں میں صلیبوں کو اُٹھائے رکھئے

زلف کی چھاؤں بڑی چیز ہوا کرتی ہے
اس اندھیرے کو اُجالوں سے بچائے رکھئے

کل کے حالات کا کیا جانئے تقاضا کیا ہو
پھول کے ساتھ ہی پتھر بھی اٹھائے رکھئے

کیا خبر کب کوئی آوارہ گھٹا آ برسے
آپ پیاسے ہیں تو پیاس اپنی بڑھائے رکھئے

ٹھہرے ہیں اسے لفظوں کا لبادہ دیدوں
لی ہے انگڑائی تو پھر ہاتھ اُٹھائے رکھئے

کم نہیں سُرخیٔ گلشن سے لہو کی رنگت
زخم کے پھول سہی پھول کھلائے رکھئے

جوہری کوئی تو بازار میں آنکلے گا
آپ قیمت تو علی اپنی بڑھائے رکھئے



لے چلو ہاتھ میں لوگو پتھر
ہیں بہت راہ میں شیشوں کے نگر

کوئی دیوار نہ سایہ نہ شجر
دھوپ ہی دھوپ ہے تا حدِّ نظر

زندگی تھی کہ صبا کا جھونکا
اُڑ گئی پھول کی خوشبو بن کر

لوگ سورج میں نہا بھی آئے
ہم اُلٹتے رہے اوراقِ سحر

وہ عبارت جو کتابوں میں نہ تھی
ہم نے چہروں میں پڑھی ہے اکثر

کس قدر فاصلے بڑھ جاتے ہیں
دو قدم دیکھئے تنہا چل کر

ہم سے عارض کی لطافت پوچھو
ہم نے دیکھے ہیں یہ شعلے چھو کر

ساتھ دیتے نہیں الفاظ علیؔ
کس طرح طے ہو خیالوں کا سفر



ہم شہر میں تھے یا کسی صحرا میں پڑے تھے
سائے بھی وہاں ہم سے بہت دور کھڑے تھے

کوتاہ بہت اُن کے خیالات کا قد تھا
کچھ لوگ جو قامت میں بہت ہم سے بڑے تھے

کشتی کسی معصوم کی جب ڈوب رہی تھی
یہ سچ ہے کہ ہم آپ کنارے پہ کھڑے تھے

دی مصلحتِ وقت نے احساس کی پستی
اُن کو جو صلیبوں کی بلندی پہ چڑھے تھے

ملتی بھی کہاں دھوپ سے بچنے کو پناہیں
دیکھا تو سبھی اپنے ہی سائے میں کھڑے تھے

اسلوب نیا دے کے اٹھا لائے ہم ان کو
فرسودہ خیالات جو بیکار پڑے تھے

کیا بھیڑ تھی اس شہر کی راہوں میں نہ پوچھو
کچھ لوگ تو خود اپنے ہی سائے میں کھڑے تھے

آج اس سے ٹپکتی ہیں عمل زہر کی بوندیں
جس شاخِ تمنا سے کبھی پھول جھڑے تھے



دھوپ سے بھاگے تو ہم کو کیا ملا
گردشِ ایّام کا سایا ملا

کیا کروں لے کر کتابِ زندگی
جو ورق الٹا وہی سادا ملا

کون دستک دے گیا کیا جانئے
در پہ خوشبو کا بس اک جھونکا ملا

سب کے لب پر اپنے غم کی بات تھی
میرے غم کا کس کو اندازہ ملا

ہم بڑی اُمید لے کر آئے تھے
تو بھی اے بادل ہمیں پیاسا ملا

شہرِ غم میں کوئی بیگانہ نہ تھا
سب سے اپنے درد کا رشتا ملا

ہم تعارف کیلئے بے چین ہیں
آنکھ تو بھی ہم سے اے دنیا ملا

اپنے آنسو پونچھنے کے واسطے
ہم کو دامن خود عؔلی اپنا ملا



موسمِ گُل ابھی اے جانِ چمن باقی ہے
تو نہیں ہے تری خوشبوئے بدن باقی ہے

ہو گئی دُور لباسوں کی شکن تو لیکن
روح و تن پر جو پڑی ہے وہ شکن باقی ہے

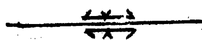
خونِ مظلوم کے چھینٹے در و دیوار پہ ہیں
آج بھی سلسلۂ دار و رسن باقی ہے

خشک ہونٹوں پہ تبسّم کی کرن ہے لیکن
دل کے بازار میں زخموں کا چلن باقی ہے

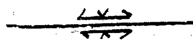
لوگ کیوں لاش اٹھائے لئے جاتے ہیں مری
کیا ابھی اس میں کوئی تارِ کفن باقی ہے

دور آئے گئے کتنے مگر اے ارضِ دکن
تیرے چہرے کا وہی سانولا پن باقی ہے

ہو گئی عام روایت شکنی جب سے علی
شعر باقی ہے نہ وہ شعر کا فن باقی ہے



مہتاب پر نہ آنکھ مری آفتاب پر
میری نظر ہے اسکی بدن کی کتاب پر





اڑی اڑی ہوئی رنگت بجھے بجھے تیور
یہ زندگی ہے کہ مسلی ہوئی کوئی چادر

بھرے نہیں ہیں ابھی زخم آفتابوں کے
ہے گرد گرد اجالا، دھواں دھواں ہے سحر

یہ گیسوؤں کی گھٹا ہے کہ رات ساون کی
یہ چاندنی ہے بدن کی کہ تاج کا مرمر

نہ جانے کتنی یہاں حسرتیں ہیں خوابیدہ
نسیمِ صبح دبے پاؤں اِس طرف سے گزر

بس آ گیا تھا ذرا اس کے پیرہن کا خیال
گزر گئی کوئی خوشبو قریب سے ہو کر

ابھی گناہ میں وہ بانکپن نہیں آیا
حیاتؔ شوق ذرا اور سج کچھ اور نکھر

سحر کی گود کے پالے ہوئے ہیں ہم لیکن
یہ اور بات کہ پہچانتی نہیں ہے سحر

علیؔ ہمیں نے پکارا نہیں اُسے ورنہ
حیاتؔ دور تلک ــــــ دیکھتی رہی مڑ کر



اس شہر میں دیکھوں جسے اپنا سا لگے ہے
ہر شخص سے جیسے کوئی رشتا سا لگے ہے

حالات کی اس بھیڑ میں امید اکیلی
صحرا میں کسی پیڑ کا سایا سا لگے ہے

سوچو تو وہ اک ساز کا چھیڑا ہوا نغمہ
دیکھو تو وہ اک گیت کا مکھڑا سا لگے ہے

یہ کیسے ہیں بادل کہ برستے تو ہیں لیکن
پیاسا مرا کھیت آج بھی پیاسا سا لگے ہے

پہنچی یہ کہاں لیکے مجھے تیری تمنّا
دنیا کسی افسانے کا ٹکڑا سا لگے ہے

مدت ہوئی تم ہاتھ چھڑا لے گئے لیکن
وہ عمر کا لمحہ ابھی ٹھہرا سا لگے ہے

کمرے کے دریچوں پہ تیری یاد کی دستک
مجھکو کسی پُروائی کا جھونکا سا لگے ہے

جو زخم مجھے اپنے رفیقوں سے ملا تھا
وہ زخم علیؔ آج بھی تازہ سا لگے ہے

اب یہی ہر آدمی کی بات ہے

یہ تہی دامن وہ خالی ہات ہے

آئینے الفاظ کے دھندلا گئے

ان سے لپٹی گردِ محسوسات ہے

سرسراتے آنچلوں کی چھاؤں میں

پر سکوں کیا گردشِ حالات ہے

آنکھ سے آنسو ابھی ٹپکے نہیں

راہ میں ٹھہری ہوئی برسات ہے

کر رہا ہوں ہر نفَس کا یوں شمار

زندگی جیسے کوئی خیرات ہے



وقت کی دھوپ سے بچنے کا مداوا بھی نہیں
زلف کی چھاؤں تو کیا دار کا سایا بھی نہیں

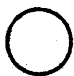
لوگ کیوں جامِ تہی لیکے بڑھے آتے ہیں
ابھی پیمانہ مری آنکھ کا چھلکا بھی نہیں

فاصلہ ہاتھ کا خود ہم نے بڑھا رکھا ہے
ورنہ دامن وہ بہت دور ہوا ایسا بھی نہیں

یہ نہیں جھوٹ کہ ہر بار تجھے دیکھا ہے
یہ بھی سچ ہے کہ ابھی تک تجھے دیکھا بھی نہیں

ہر طرف سے مجھے آئینہ دکھاتے ہیں سراب
منھ چھپانے کیلئے دامنِ صحرا بھی نہیں

آنچ سے اس کی مرے شعر پگھلتے ہیں علیؔ
اُف وہ پیکر کہ جسے ہاتھ لگایا بھی نہیں



کوئی شیشہ ہی ہاتھ سے چھوٹے
یہ بھیانک سکوت تو ٹوٹے

یہ تو سنسان راستے جانیں
وقت نے کتنے کارواں لوٹے

جلتی لاشوں کی روشنی ہی سہی
ظلمتوں کا غرور تو ٹوٹے

جو اٹھائے ہوئے صحیفے ہیں
دے رہے ہیں وہی بیاں جھوٹے

چاند سورج بکھیرنے والو
اس طرف بھی کوئی کرن پھوٹے

طرزِ نوائے علی بجا لیکن
فن کا دامن نہ ہاتھ سے چھوٹے

مزاجِ طنز کا ہر اک سخن میں کتنا تھا
شعورِ آپ کے دیوانہ پن میں کتنا تھا

یہ بات اور زمین لالہ زار ہم سے ہے
وگرنہ خون ہمارے بدن میں کتنا تھا

ابھی تک مرے ہاتھوں کا لمس مہکے ہے
نہ جانے عطر ترے پیرہن میں کتنا تھا

ہے زخم زخم وفا آج شاہراہوں پر
کبھی وفا کا چلن اِس دکن میں کتنا تھا

علیؔ کا نام جو اب اجنبی سا لگتا ہے
کبھی یہ نام تری انجمن میں کتنا تھا



بات اب تک جو تھی پردہ داروں کے بیچ
بات رکھ دی وہ ہم نے ہزاروں کے بیچ

زندگی اور یہ دھوپ حالات کی
جیسے ندّی بہے ریگزاروں کے بیچ

پیار کی آنچ میں تپ رہے تھے یہاں
آپ کیوں آ گئے ان شراروں کے بیچ

یوں بھٹکتے ہیں ماضی کی گلیوں میں ہم
جیسے چلتا ہو کوئی مزاروں کے بیچ

اور تھے وہ جو دھوکے میں مارے گئے
ہم تو لوٹے گئے اعتباروں کے بیچ

آج حالات کے موڑ پر ہم علیؔ
بے سہارا ہیں کتنے سہاروں کے بیچ



تمام عمر ہتھیلی میں سنسناتا ہے
وہ ہاتھ ہاتھ میں آکر جو چھوٹ جاتا ہے

نگاہ و دل کے دریچے تو کھول کر رکھوں
اسی طرف وہ دبے پاؤں کوئی آتا ہے

سمو کے حس میں چٹانوں کا عزم رکھتا ہوں
وہی خیال کبھی چھن سے ٹوٹ جاتا ہے

بڑے سکون سے سر رکھ کر میری چوکھٹ پر
نہ جانے وقت کہاں کی تھکن مٹاتا ہے

وہ سایہ روز اندھیرے ڈھونڈتا ہے مجھے
جو روشنی میں مرے ساتھ آتا ہے

شعورِ فکر مرا سنگ و خشت سے بھی علیؔ
خیال و خواب کے پیکر تلاش لاتا ہے



یہ کس مقام پہ پہنچی ہے لیکے بے وطنی
نہ رنج جامہ دری ہے نہ فکرِ بے کفنی

ترے دیار سے نکلے تو دھوپ ساتھ چلی
کہیں ملی نہ ہمیں گیسوؤں کی چھاؤں گھنی

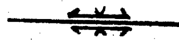
یہ بدنصیب ہیں ان پر بہائیے آنسو
دیا ہے ان کو وطن نے پیامِ بے وطنی

مہکتی زلف سے رخسار و لب سے آنچل سے
کہاں کہاں سے چھنی ہے تمہاری گل بدنی

قدم قدم پہ ہو بکھری ہوئی غزل جیسے
یہ رنگ رنگ قبائیں یہ ننگ پیرہنی

مہکے سایے زمانے کو جس نے بخشے تھے
ہمارے حق میں وہی شاخِ گل صلیب بنی

بہت لطیف و سبک شاعری کا فن ہے علی
یہ کارِ شیشہ گری ہے نہیں ہے سنگ زنی



نام روشن کیا سویروں کا
کیجئے احترام اندھیروں کا

نظمیں

- شہر سخن
- نیا دور
- ٹوٹے تارے
- فاصلہ
- سنگ میل
- مشاہدہ
- یہ رات
- اندھیرے
- ٹھنڈی کرن

ساتھ دیتے نہیں الفاظ علیؔ
کس طرح طے ہو خیالوں کا سفر

شہرِ سخن

یہ کس شہرِ سخن میں آ گئے ہم
یہاں حدِّ نظر تک ایک ویرانی سی ویرانی
دریچے بند بام و در ہیں خالی
جھروکوں میں ہے سناٹا
کہیں بھی رسمِ دلداری نہیں ہے
محبت کا یہاں اظہار ہے جرم
حدیثِ گیسو و رخسار ہے جرم
خیالوں کے شبستاں بند کر دو

کوئی خوشبو کا جھونکا آ نہ جائے
کوئی آوازِ پا چونکا نہ جائے

یہ کس شہرِ سخن میں آ گئے ہم
یہاں چلتا ہے سکّہ کج روی، بے اعتدالی کا
چلن ہے کھردرے پن کا
یہاں اکھڑا ہوا لہجہ سند فنکار ہونے کی
نئے معمار ہونے کی

یہ کس شہرِ سخن میں آ گئے ہم
یہاں احساسِ تنہائی بہت ہے
یہاں ہر شخص اپنی ذات میں بکھرا ہوا ہے
یہاں لفظوں کے چہرے مسخ ہیں
ترسیل ممنوعہ شجر
ابلاغ بے معنی
پرانی ہو گئیں یہ اصطلاحیں

کھڑی ہیں راستہ روکے
فصیلیں
چیستاں، ابہام، ژولیدہ بیانی کی

یہ کس شہرِ سخن میں آ گئے ہم
یہاں ہر قید سے ہے فکر آزاد
یہاں ملتی ہے فن کے قتل کی داد
شکست و ریخت کا بازار ہے گرم
پڑے ہیں جابجا ملبے کلاسیکی روایت کے
ہے چلنا دو قدم مشکل
یہ کس شہرِ سخن میں آ گئے ہم

نیا دور

آیا دور نیا
بیتے عہد کی لاش کو اپنے پاؤں تلے
روندتا آیا دور نیا
اور نیلے آکاش کی پگڈنڈی سے اتری
صبح نئی
لے کر اپنے قدموں میں متھیلے سویرے
دُور اُفق کی دیواروں سے ابھرا سورج
وقت کی سیڑھی پر چڑھتی ہے
دھوپ نئی

بیت گیا اک دور، سفر اک ختم ہوا
جانی پہچانی سب راہیں چھوٹ گئیں

اور نظر کی پہنائی تک پھیلے ہیں
بیگانے، انجانے رستے
ان رستوں کی ننگی چھاتی پر
کیا جانے
کتنے اندھیرے راہ ہماری دیکھ رہے ہیں
کتنے ناگ ہمیں ڈسنے کو
منھ کھولے بیتاب کھڑے ہیں
کیا جانے
کتنے اجالے راہ ہماری دیکھ رہے ہیں
کتنوں کے چہروں پہ شفق کی لالی لیگی انگڑائی
کتنوں کے ارمانوں کے کھیتوں میں سرسوں پھولیگی
یا شعلوں کی فصل اُگے گی
یا بادل پھلواری پر منڈلائیں گے
یا برسیں گے صحراؤں کی گود میں
یا چٹانوں پر •

ٹوٹے تارے

میں نے کل رات
آسماں سے ٹوٹ کر گرتے ستارے دیکھ کر
اپنا دامانِ تہی پھیلا دیا بڑھ کر ___ مگر
کچھ تو ان میں سے خلاؤں ہیں بھٹک کر رہ گئے
اور کچھ تو
ایسے دامانوں میں آ کر گر پڑے
تھے جو پہلے ہی شہابوں سے بھرے
اور کچھ
گر کر زمیں پر بجھ گئے
میرا دامانِ تہی خالی کا خالی ہی رہا

فاصلہ

تری آنکھوں میں تھے مستی کے ڈورے
مہکتے تھے ترے رخسار کل تک
لگاوٹ تیرے ہر انداز میں تھی
غضب تھا حسن کا اظہار کل تک
مقابل آئینہ رہتا تھا تیرے
جوانی تھی تری بیدار کل تک
بلاتی تھی مجھے کس نغمگی سے
ترے پازیب کی جھنکار کل تک

نہ رہتی تھی کبھی پھولوں سے خالی
یہ تیری زلف عنبر بار کل تک
جدا لب سے نہ ہوتا تھا تبسم
رسیلی تھی تری گفتار کل تک
قیامت تھی تری رنگین مزاجی
لبوں پر تھے مرے اشعار کل تک
مرے شانے پہ تم رہتی تھی پہروں
تری گردن صراحی دار کل تک

مگر اک عمر کی دیوار جب سے
ہمارے بیچ حائل ہو گئی ہے
مجھے محسوس یوں ہوتا ہے جیسے
کہ تو ہاتھوں سے میرے کھو گئی ہے
سنورنے کی نہیں اب تجھکو فرصت
سجاوٹ بات جیسے دور کی ہے

نہیں باقی وہ احساسِ جمال اب
سنہری جلد میلی ہو گئی ہے
ترے ماتھے پہ وہ جو چاندنی تھی
بکھیڑوں کی ردا میں چھپ گئی ہے
تبسم کے شرارے ہیں بجھے سے
شفق ہونٹوں کی پھیکی پڑ گئی ہے
شکن آلود پیراہن ہے تیرا
ترے آنچل کی حالت میلی ہے
ہیں سوکھے بال بے ترتیب تیرے
ادا الجھی نظر الجھی ہوئی ہے
وہ خوشبو اب کہاں تیرے بدن کی
کسی گوشے میں جا کر سو گئی ہے
یہ کیسا فاصلہ، یہ کیسی دوری
مری ہو کر بھی اب تو اجنبی ہے

سنگ میل

رات پگھلی آفتاب ابھرا
افق کے لب سنہرے ہو گئے
چھوڑ کر تاروں کا سیج اٹھی سحر
پھوٹی کرن
پھڑپھڑائیں ظلمتیں زخمی پرندوں کی طرح
اور ان کے جسم سے ٹپکی ہوئی ایک ایک بوند
بن گئی عنوان مری تاریخ کا

ٹوٹ کر برسی گھٹا

بجھ گئی صدیوں کی پیاس
ٹوٹ کر قدموں میں بکھری کہکشاں
بن گئے ذرّے چراغ
فاصلے کم ہو گئے
منزلِ دار و رسن طے ہو گئی

لیکن اے میرے رفیقو! ہم جلیسو! ہمدمو!
کیا یہی وہ سرزمینِ آرزو ہے
کیا یہی ہے وہ افق کے پار کی بستی
جسے خوابوں کی وادی میں بسا رکھا تھا ہم نے
آج تک
یہ وہ منزل ہی نہیں جس کے لئے نکلے تھے ہم
یہ تو ہے اک سنگِ میل
•

مشاہدہ

ہم نے ایسی ہنسی بھی دیکھی ہے
جس سے اڑتی ہے درد و کرب کی دھول
جو نقیب طرب نہیں ہوتی
اور دیکھے ہیں ایسے آنسو بھی
جن سے خونِ جگر نہیں رِستا
جو سفیرِ نشاط ہوتے ہیں

ہم نے ایسے بھی پھول دیکھے ہیں
جن سے دل کو سکون نہیں مِلتا
جو مہکتے نہیں کھٹکتے ہیں
اور ایسے بھی خار دیکھے ہیں

کام آتے ہیں جو مصیبت میں
بڑھ کے دامن جو تھام لیتے ہیں

ہم نے ایسے بھی دیکھے ہیں بادل
جن کو کھیتوں سے بیر ہوتا ہے
جو سمندر پہ جا برستے ہیں
اور ایسے بھی کھیت دیکھے ہیں
جن کی مٹی سے بھوک اگتی ہے
جو کسی کا شکم نہیں بھرتے
ہم نے ایسی بھی شمع دیکھی ہے
جس کا گٹھ جوڑ ہے اندھیروں سے
تیرگی اور جو بڑھاتی ہے
اور ایسی بھی رات دیکھی ہے
جس کی انجم بدوش تاریکی
پردہ پوشِ گناہ ہوتی ہے
●

یہ رات

میری ساتھی، مری شریکِ حیات
اک ذرا اور پاس آجاؤ
آج کی رات ہے سہاگ کی رات
اور اس حجلۂ عروسی میں
میں اِدھر بے قرار بیٹھا ہوں
سمٹی سمٹائی اُس طرف تم ہو
دور تک خامشی سی چھائی ہے
اور مہکا ہوا ہے سناٹا

میری ساتھی، مری شریکِ حیات
اک ذرا اور پاس آجاؤ
رات کی عمر مختصر ہے بہت
آؤ اس کو نچوڑ کر پی لیں

آج تم میری بن کے آئی ہو
لیکے بارات آرزوؤں کی
دل کی دھڑکن چھپائے چھاتی ہیں
ہاں اسی واسطے تو کہتا ہوں
اک ذرا اور پاس آجاؤ
تاکہ آنچل ہٹا کے مکھڑے سے
آج اس کے گھنے اجالوں میں
اپنے جذبات کی سحر کر لوں
رخ پہ بکھرا کے عنبریں زلفیں
اپنی سانسوں میں روشنی بھر لوں

میری ساتھی، مری شریکِ حیات
اک ذرا اور ادھر سرک آؤ
آج جی بھر کے دیکھ لوں تم کو
سرخ ڈورے تمہاری آنکھوں کے
تمتماہٹ تمہارے گالوں کی

دست و بازو کی چمپئی رنگت
آج کے بعد یہ کنورا روپ
پھر ملے گا نہ دیکھنے کے لئے
کچھ دنوں بعد یہ نکھار یہ جسم
وقت کی گرد کے دھندلکوں میں
رنگ روپ اپنا سارا کھو دے گا
اور آلامِ روزگار کی دھوپ
گھر کے آنگن میں پھیل جائے گی
میری ساتھی، مری شریکِ حیات
اک ذرا اور پاس آجاؤ
وقت کو آؤ آج ٹھہرالیں
آرزوؤں کو آج دہکالیں
پی کے رس ایک ایک لمحہ کا
آج کی رات کو امر کرلیں
ہاں اسی واسطے تو کہتا ہوں
اک ذرا اور پاس آجاؤ

اندھیرے

لیکے نکلا تھا میں افکار کی جلتی مشعل
چاہتا تھا کہ اندھیروں کو جلا کر رکھ دوں
توڑ دوں ان کا غرور
چھین لوں رات سے اس کا افسوں
اس کے آنگن میں سویروں کی اذاں دوں لیکن
میں نے دیکھا
کہ یہ بیدرد یہ بے رحم اندھیرے بے خوف
میرے قدموں کی طرف رینگتے بڑھتے ہی چلے آتے ہیں
کالے سانپوں کی طرح
اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس رات کی چادر کی تہیں
ہو گئیں اتنی گھنی، اتنی دبیز
کہ مری فکر، تخیل میرا دونوں
منھ کے بل گر پڑے کھا کر ٹھوکر
جا گری دور کہیں
ہاتھ سے چھوٹ کے افکار کی جلتی مشعل

●

ٹھنڈی کرن

آف یہ برسات میں ایک بھیگا بدن
اوس میں جیسے لپٹی ہو ٹھنڈی کرن
ایک برفیلا شعلہ پگھلتا ہوا
اک لطافت کے ساگر میں ڈوبا چمن
بادلوں میں تڑپتی ہوئی بجلیاں
جھینی ساری سے چھنتے خطوطِ بدن
سرخ عارض سے انگارے لپٹے ہوئے
آگ پانی کا ہوتا ہو جیسے ملن
مرمریں جلد کی دودھیا چاندنی
ترشے پیکر کا نکھرا ہوا بانکپن

روپ دعوت گناہوں کی دیتا ہوا
رس چراتے ہوئے رس سے بوجھل نین
کومل انگوں سے بوندیں ٹپکتی ہوئی
جیسے ساغر سے چھلکے شراب کہن
گورے ماتھے پہ اوشا کی انگڑائیاں
چکنے گالوں پہ کھلتے گلاب و سمن
نوجوانی کا سونا پگھلتا ہوا
جیسے برکھا کی رُت میں چناروں کا بن
لال ہونٹوں پہ صدقے شفق کا لہو
بھیگے چرنوں پہ قرباں گنگ و جمن
چال جیسے ندی ایک چڑھتی ہوئی
بال جیسے کہ کاجل کا دھویا گگن
رس بھری جیسے ٹھمری کوئی یا غزل
اُف یہ برسات میں ایک بھیگا بدن

●

پیاس

دور افق کے گوشوں تک
پھیلا ہے سمندر
حدِ نظر تک پانی ہی پانی
لیکن
میں ساحل پر پیاسا ہوں
صدیوں کی ہے پیاس یہ میری
کیا تم
اپنے آنسو بھی دو گے نہ مجھے
پینے کے لئے

●

لہو

آج بھی میرا لہو تازہ ہے
جیسے ٹپکا ہو ابھی
اور اس ٹپکے ہوئے خون کے
ہر قطرہ سے
آج بھی بوئے وفا آتی ہے

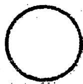
●

غزلیں



دردِ دل اِس میں سلیقہ سے ادا ہوتا ہے

تبصرہ بعد میں بھی قتل پہ ہو سکتا ہے
پہلے یہ لاش تو رستے سے ہٹا دی جائے



ان کے ہونٹوں سے چن کر گلاب و سمن
ہم نے توڑا ہے اکثر غرورِ چمن

تیرے دامن کی خوشبو سمیٹے ہوئے
آج تک میرے بستر کی ہے ہر شکن

ایسے لوٹے گئے ہم ترے شہر میں
ہو گئی ہر تمنا غریب الوطن

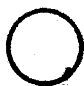
زندگی کل عبارت اجالوں سے تھی
زندگی آج ہے ایک میلا کفن

اپنی تنہائیوں کو لئے دوش پر
کوئی پھرتا رہا انجمن انجمن

تازگی جیسے ان کا مقدر نہیں
سب کے چہروں پہ ہے زندگی کی تھکن

آج پلٹے ہیں حالات کی گردشیں
کل جو ہوتے تھے چھونے سے میلے بدن

ہم نے تلخی چھپالی علی شعر کی
دیکھئے الفاظ کا خوشنما پیرہن



کوئی جھونکا جو دبے پاؤں چلا رات گئے
مجکو دھوکا ترے قدموں کا ہوا رات گئے

آکے پلکوں پہ کوئی اشک رکا رات گئے
اک چراغ اور سرِ بزم جلا رات گئے

دامنِ صبح میں بجھتے ہوئے تاروں کی طرح
کسی بیمار نے دم توڑ دیا رات گئے

دیکھنے کے لئے عالم تری انگڑائی کا
رک گیا وقت بھی کچھ دیر ذرا رات گئے

ان کے ہونٹوں پہ ہنسی تھی، مری آنکھوں میں نمی
ایک افسانہ سنا، ایک کہا رات گئے

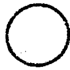
اس نے کھولیں جو ذرا نیند سے بوجھل آنکھیں
میں یہ سمجھا درِ میخانہ کھلا رات گئے

ہم علیؔ سنکے بھی انجان سے انجان رہے
زندگی دور سے دیتی تھی صدا رات گئے

●

آئینے تو بہت ملے لیکن
اپنا چہرہ ہمیں کہیں نہ ملا

●



بال بکھرا کے چہرے پہ ڈالے گئے
رات آئی، سحر کے اُجالے گئے

تیری آنکھوں کا کاجل گھٹا لے اُڑی
پھول عارض کی خوشبو چُرا لے گئے

دوستوں کی مدارات کے واسطے
میری آنکھوں کے ساغر کھنگالے گئے

ساری دنیا بہاروں سے اُلجھی مگر
اک ہمیں تھے جو دامن بچا لے گئے

ساتھ میرے مری گمراہی یوں چلی
راستے جیسے منزل اٹھا لے گئے

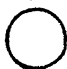
ایک ایوان کی روشنی کے لئے
کتنے آباد گھر پھونک ڈالے گئے

اُن کی محفل میں بٹتے تھے آنسو حلیؔ
ہم بھی آنکھوں کے لیکر پیالے گئے



چھوڑ دے ہاتھ اے بہار مرا
حادثوں کو ہے انتظار مرا





کون جانے کدھر آتی ہے کدھر جاتی ہے
زندگی ایسے دبے پاؤں گزر جاتی ہے

آج ہنستے ہوئے چہروں کو ترستی ہے نظر
زخم رِستے ہیں جہاں تک کہ نظر جاتی ہے

خار بن کر کبھی آنکھوں میں کھٹکتی ہے حیات
پھول بن کر کبھی قدموں میں بکھر جاتی ہے

تیری بکھری ہوئی زلفوں کا سہارا پا کر
رات بھیگی ہوئی کچھ اور سنور جاتی ہے

زندگی تھی جو حوادث کے مقابل کل تک
آج خود اپنی ہی پرچھائیں سے ڈر جاتی ہے

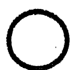
آپ مفہومِ محبت نہ خدارا سمجھیں
آب دو روز میں چہرے کی اتر جاتی ہے

موڑ ہوتا ہے علیؔ وہ کسی میخانے کا
گردشِ وقت جہاں آ کے ٹھہر جاتی ہے



ہنگامۂ حیات سے جب واسطا پڑا
ہر حادثے سے اپنا پتہ پوچھنا پڑا





وقت نے جب دھوپ پھیلائی بہت
یاد آئی اپنی پرچھائی بہت

تشنگی دریاؤں نے بخشی مجھے
میکدوں نے آنکھ چھلکائی بہت

مہربانوں کے کرم سے جو ملے
تھی انہیں زخموں کی گہرائی بہت

ہم ہی بھاگے زندگی سے دور دور
زندگی ہم سے قریب آئی بہت

میکدوں سے کام کیا مجھکو علیؔ
ہے یہ میرا جام مینائی بہت



دل کس کا غم و درد سے معمور نہیں ہے
آرام ترے شہر کا دستور نہیں ہے

لو جلتے چراغوں کی بہت تیز ہے لیکن
بجھتے ہوئے چہروں پہ کہیں نور نہیں ہے

جو رات کہ مدت ہوئی دم توڑ چکی تھی
کیا اب بھی وہی رات بدستور نہیں ہے

سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ ہنسی آ تو گئی ہے
لیکن ابھی پلکوں سے نمی دور نہیں ہے

کیوں خون چراغوں میں جلانے ہو ہمارا
ایسا تو کسی بزم کا دستور نہیں ہے

ہنسنے کیلئے بھی ہے اجازت کی ضرورت
یہ اسکی ہے روداد جو مجبور نہیں ہے

میں قد تو علیؔ اور ذرا اپنا بڑھا لوں
لیکن مرے احباب کو منظور نہیں ہے



گلشن گلشن دام بہت ہیں
اب یہ منظر عام بہت ہیں

میخانے آباد ہیں دل کے
ٹوٹے پھوٹے جام بہت ہیں

آزادی کی بات نہ پوچھو
آزادی کے دام بہت ہیں

شمعوں پر کچھ آنچ نہ آئی
پروانے بدنام بہت ہیں

گیسو، لب، رخسار، تبسم
فصلِ گل کے نام بہت ہیں

ہم کو طعنہ دینے والو
تم پر بھی الزام بہت ہیں

مہکے جن سے شعرِ علیؔ کے
ایسے گل اندام بہت ہیں



وقت کو جب بھی اسیروں کا خیال آیا ہے
لیکے زنجیر ہر اک پاؤں میں ڈال آیا ہے

دور تک ساتھ بہاروں کے رہی گردِ خزاں
پھول مہکے ہیں تو زخموں کا خیال آیا ہے

رکتے رکتے ہی سہی، کچھ تو عنایت ہو جواب
ڈرتے ڈرتے مرے ہونٹوں پہ سوال آیا ہے

وہی دوری، وہی دیوار، وہی تشنہ لبی
لیکے مجکو یہ کہاں روزِ وصال آیا ہے

میرے افکار سے لپٹی ہے ترے جسم کی بو
میرے شعروں میں ترا رنگِ جمال آیا ہے

کوہساروں پہ کبھی برق جو لہرائی ہے
تیرے ڈھلتے ہوئے آنچل کا خیال آیا ہے

ایک اک لفظ کو بخشا ہے علی میں نے لہو
تب کہیں جا کے مرے فن میں کمال آیا ہے



آنکھوں سے دل کا درد چھلکتا دکھائی دے
خالی ہے شیشہ اور چھلکتا دکھائی دے

اس راہ سے بفیض جنوں ہم گزر گئے
جس راہ میں خیال بھی تھکتا دکھائی دے

وہ پھول ہے نہ اس کو ہے نسبت بہار سے
پھر بھی بدن تمام مہکتا دکھائی دے

آنکھوں نہیں لیکے آپ کے نقش قدم کوئی
دیر و حرم کے پاس بھٹکتا دکھائی دے

دم توڑتی ہے کیا کوئی دیرینہ آرزو
دل کے قریب کوئی سسکتا دکھائی دے

تنہائیوں کی شام خیالوں کی اوٹ سے
کندن سا ایک جسم دمکتا دکھائی دے

اک دل ہی بچ رہا تھا علی وہ بھی شام سے
مثلِ چراغِ صبح بھڑکتا دکھائی دے



درد کے ڈھیر ملے، زخم کے انبار ملے
دامنِ دشت سے نا دامنِ گلزار ملے

آج کس موڑ پہ یہ عشق کے بازار ملے
پیار کے نام پہ جسموں کے خریدار ملے

اُن کے ہونٹوں سے ہنسی مانگ رہی ہے دنیا
جن کو رونے کیلئے دیدہ خونبار ملے

ظلمتوں کو جو نچوڑا ہے تو ٹپکی ہے سحر
خارزاروں کو سمیٹا ہے تو گلزار ملے

تجکو ہم ڈھونڈنے نکلے تو تری یادوں کے
چند ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پسِ دیوار ملے



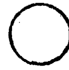
فضا بہار کی چپ، ساز کی نوا خاموش
صدائے درد کے آگے ہے ہر صدا خاموش

یہ خشک ہونٹ، یہ تر آنکھ، یہ بجھے چہرے
یہ لوگ عہد کا ہیں اپنے مرثیا خاموش

نہ جانے آج کہاں ہیں وہ دار کے راہی
پڑا ہے کب سے صلیبوں کا راستا خاموش

بڑے عجیب سے یہ فاصلے ہیں قربت کے
نگاہِ ناز ہے چپ چپ ادا ادا خاموش

یہ سنتے ہیں کہ علی میکدے کے موڑ تھے وہ
جہاں سے ہو کے زمانہ گزر گیا خاموش



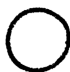
اے کشتۂ رسم و راہِ وفا اندازِ خیال و فکر بدل
سو گام خرد کے ساتھ چلا، دو گام جنوں کے ساتھ بھی چل

اے برق جلا کر گھر اپنا کیا ظرف سے تیرا دیکھ لیا
تنکوں میں مری کیا رکھا تھا، جتنا تھا کسی کا رنگ محل

سوچا تو سمجھ میں یہ آیا دیوانے ہمیں تھے کچھ شاید
زنداں کو نشیمن جان لیا، گلشن کو سمجھ بیٹھے مقتل

ناداں ذرا سی ہستی کا کیوں اتنا بڑا ہنگامہ ہے
دو گام کا یہ افسانہ ہے اک گام حیات اک گام اجل

کچھ سایے بکھرتی زلفوں کے کچھ دھوپ مزاجِ دوراں کی
دیکھو تو کہاں تک آج علیؔ ہے پھیلا ہوا دامانِ غزل



ایک مدت ہوئی مسکرائے ہوئے آ گئی ہے آتے آتے ہنسی دوستو
وقت نے اشک تو پونچھ ڈالے مگر اب بھی آنکھوں میں ہے کچھ نمی دوستو

چھوڑ کر میں نہ جاؤں گا یہ آشیاں تنکے تنکے میں ضم ہے مری داستاں
ایک اک پھول پر میرا حق بھی تو ہے میں بھی جانِ چمن تھا کبھی دوستو

ایک دو پھول گلشن کے مہکے تو کیا کتنے گوشے تو اب بھی ہیں اجڑے ہوئے
کیا یہی موسمِ گل کا انصاف ہے کیا صبا کا چلن ہے یہی دوستو

غم نہیں اب جو ہیں پھول گلشن میں کم ہر قدم پر یا فراط ہیں خارِ غم
جب بھی شکوہ تہی دامنی کا نہ تھا اب بھی دامن نہیں ہے تہی دوستو

خون ہو کر علیؔ کا جگر جب بہا درد افکار کے روپ میں ڈھل گیا
ایک اک حرف تاریخِ امروز ہے اسکو سمجھو نہ تم شاعری دوستو



نہ وہ صہبا، نہ وہ مینا، نہ وہ جامِ کہن ساقی
کہاں ہے آج وہ میخانۂ ارضِ دکن ساقی

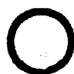
یہ عارض کی لطافت ہے تو پھولوں کا خدا حافظ
یہ آنکھیں ہیں تو ہے بیکار ساغر کا چلن ساقی

وہی مستی وہی گرمی وہی رنگت وہی خوشبو
مئے رنگیں ہے شیشے میں کہ ہے تیرا بدن ساقی

ہجومِ بادہ ساغر میں بھی جیسے اکیلا ہوں
مری تنہائیاں ہیں انجمن در انجمن ساقی

اٹھا کر جام تو ہی میرے ہونٹوں سے لگا دینا
مرے ہاتھوں میں ہو جب سرسراتا پیرہن ساقی

علی اُن پر تصدق ہیں چمن قربان میخانے
تراشے ہیں مرے شعروں نے ایسے گلبدن ساقی



خوشی نے مجکو ٹھکرایا ہے درد و غم نے پالا ہے
گلوں نے بے رخی کی ہے تو کانٹوں نے سنبھالا ہے

محبت میں خیال ساحل و منزل ہے نادانی
جو ان راہوں میں لٹ جائے وہی تقدیر والا ہے

جہاں بھر کو متاع لالۂ و گل بخشنے والو
ہمارے دل کا کانٹا بھی کبھی تم نے نکالا ہے

کناروں سے مجھے اے ناخداؤ دور ہی رکھنا
وہاں لیکر چلو طوفاں جہاں سے اٹھنے والا ہے

چراغاں کر کے دل بہلا رہے ہو کیا جہاں والو
اندھیرا لاکھ روشن ہو اجالا پھر اجالا ہے

نشیمن ہی کے لٹ جانے کا غم ہوتا تو غم کیا تھا
یہاں تو بیچنے والوں نے گلشن بیچ ڈالا ہے



ایسی بھی زندگی ہیں دعا مانگتے ہیں لوگ
مجرم نہیں ہیں اور سزا مانگتے ہیں لوگ

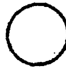
سب کچھ تو نذرِ خاطرِ احباب کر چکا
اب اور اس غریب سے کیا مانگتے ہیں لوگ

آنکھوں میں چبھ رہی ہے کرن آفتاب کی
گھبرا کے ظلمتوں کی دعا مانگتے ہیں لوگ

رکھتے ہیں دوستوں سے توقع خلوص کی
صحراؤں سے نسیم و صبا مانگتے ہیں لوگ

یہ حبس یہ گھٹن یہ در و بام یہ حصار
جینے کو آج تازہ ہوا مانگتے ہیں لوگ

احساسِ کمتری نے دکھایا یہ دن علی
حق بھی بنامِ لطف و عطا مانگتے ہیں لوگ



سنتے ہیں غم و درد میں تاثیر بڑی ہے
ٹپکا ہے کہیں خون کہیں چھینٹ پڑی ہے

تنہائی کی چلمن جو پڑی تھی سو پڑی ہے
آئی ہے تری یاد مگر دور کھڑی ہے

خوشبوئے بدن آتشِ لب، سرخیِ عارض
کتنوں کی جوانی مرے ساغر میں پڑی ہے

کانٹوں کی خلش میری کہانی کا ہے ٹکڑا
پھولوں کی ہنسی تیرے فسانے کی کڑی ہے

وہ ایک کرن گوشۂ دل میں جو پڑی ہے
وہ ایک کرن کتنے اندھیروں سے لڑی ہے

ماضی کو علیؔ ہم نے بھلایا تو ہے لیکن
جیسے کوئی پرچھائی ابھی ساتھ کھڑی ہے



اب چھلکتے ہوئے ساغر نہیں دیکھے جاتے
توبہ کے بعد یہ منظر نہیں دیکھے جاتے

مست کر کے مجھے اوروں کو لگا منھ ساقی
یہ کرم ہوش میں رہ کر نہیں دیکھے جاتے

باغبانوں کا یہ اندازِ نظر تو دیکھو
پھول بھی پھول سمجھ کر نہیں دیکھے جاتے

اُن سے کہہ دو کہ وہ تکلیف نہ دیں آنکھوں کو
جن سے یہ بسے ہوئے گھر نہیں دیکھے جاتے

ہم نے دیکھا ہے زمانے کا بدلنا لیکن
ان کے بدلے ہوئے تیور نہیں دیکھے جاتے

ساتھ ہر ایک کے اس راہ میں چلنا ہوگا
عشق میں رہزن و رہبر نہیں دیکھے جاتے



زہرِ غم پی کے ہنسی ہونٹوں پہ بکھرا لائے
ہم ترے شہر سے جینے کا سلیقا لائے

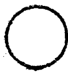
وقت کل اپنے اشاروں پہ چلا کرتا تھا
ہے کوئی آج جو اس وقت کو پلٹا لائے

ہم تو بربادِ زمانہ تھے ہمارا کیا تھا
آپ کیوں اچھی بھلی آنکھ کو چھلکا لائے

دوستوں کیلئے ہم بن کے جلے شمع و چراغ
اپنے گھر کیلئے مانگے کا اجالا لائے

اپنے دامن کا بھرم بھی تو مجھے رکھنا تھا
لانے والے تو مرے واسطے دنیا لائے

فکرِ منزل میں تھکن ہم نے مٹائی نہ علیؔ
راستے لاکھ گھنے پیڑوں کا سایا لائے



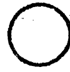
میرے احباب کو اب فکر یہی رہتی ہے
دیر تک کیوں مرے ہونٹوں پہ ہنسی رہتی ہے

زندگی سے کبھی رہتا ہے بس اتنا رشتہ
پاس رہکر بھی بہت دُور کھڑی رہتی ہے

بال بکھرا کے جہاں آپ ٹھہر جاتے ہیں
بس وہیں جاتی ہوئی رات رکی رہتی ہے

تم تو جھونکے کی طرح آ کے نکل جاتے ہو
دیر تک وقت کی رفتار تھمی رہتی ہے

اپنے چہرے بھی نظر آتے نہیں اپنے علیؔ
ان پہ یوں گردِ مہ و سال جمی رہتی ہے



آپ کے ہونٹوں کی سرخی ہو بہو
جیسے ٹپکا ہو ابھی تازہ لہو

سامنے دل کے نظر کے روبرو
بیچ دی ہم نے قلم کی آبرو

بھیگی آنکھوں پر ہیں سایے زلف کے
شام ڈھلتی ہے کنارِ آبجو

ان کے عارض لالۂ و گل کا بھرم
ان کی آنکھیں میکدے کی آبرو

کرنے والوں نے چراغاں تو کیا
یہ نہ دیکھا کس کا جلتا ہے لہو

وقت ہی اس کا کرے گا فیصلہ
موردِ الزام میں ہوں یا کہ تو

مصلحت صحرا کی جانب لے گئی
سامنے تھی کائناتِ رنگ و بو

تشنگی کتنوں کی یاد آئی مجھے
جب کبھی ہونٹوں تک آیا ہے سبو



کتنے افسانے بنے پیار کی رسوائی تک
میری تنہائی سے لیکر تری انگڑائی تک

تذکرہ جب بھی غزالانِ چمن کا نکلا
بات پہنچی وہ ترے پیکرِ زیبائی تک

میری پلکوں پہ پڑی ہیں ابھی اُن کی زلفیں
صبح کی دھوپ اُتر آئی بھی انگنائی تک

تلخ یادوں کے نئے زخم عنایت کرکے
لے گئی چھین کے دنیا مری تنہائی تک

زندگی ساتھ ہے مدت سے نہیں یہ بھی غلط
یہ بھی سچ ہے کہ نہیں اس سے شناسائی تک

چھو کے پلٹی جو نظر میری کبھی اس کا بدن
دیر تک جیسے بھٹکتی رہی بینائی تک

سب نے دیکھا فقط الفاظ کی رنگینی کو
کوئی پہنچا نہ خیالات کی گہرائی تک

بیچ رستے میں سبھی تھک کے علی بیٹھ گئے
کوئی پہنچا نہ صلیبوں کی مسیحائی تک



آپ کے ساتھ اور یہ لمحات
جیسے پھولوں پہ چل رہی ہے حیات

دھیمی دھیمی ہے آگ جسموں کی
قطرہ قطرہ پگھل رہی ہے رات

جن پہ سائے تھے تیرے آنچل کے
اڑ گئے پر لگا کے وہ لمحات

کر گئے شاخ شاخ کو زخمی
نرم و نازک تھے کیا بہار کے ہات

زورِ طوفاں کا تھم گیا لیکن
ڈوبنے کے ابھی ہیں امکانات

ہم تو بدنام ہی سہی لیکن
آپ پر بھی بہت ہیں الزامات

فرشِ گُل سے بساطِ صحرا تک
کتنے خانوں میں بٹ گئی ہے حیات



وہ آتے ہیں پلکوں پہ آنسو سجائے
غمِ زندگی سے کہو مُسکرائے

یہ موسم، یہ ساقی، یہ زلفوں کے سائے
گناہوں سے اب کون دامن بچائے

یہ سمجھو گلی ہے وہ میکدے کی
جہاں چلتے چلتے قدم ڈگمگائے

بڑھیں جب کبھی الجھنیں زندگی کی
تری زلف کے خم بہت یاد آئے

حوادث نے روکی جہاں راہ اپنی
وہیں جستجو کے نئے موڑ آئے

ذرا اپنا ذوقِ اسیری تو دیکھو
چمن بیچ کر ہم قفس مول لائے

خدا کیلئے یوں نہ بکھراؤ زلفیں
گھنی چھاؤں پا کر کوئی رک نہ جائے

علیؔ اپنی حالت پہ ہم بھی ہنسے کچھ
بڑی دیر تک لوگ بھی مسکرائے



کانٹوں سے تھے بھرے ہوئے گلشن جگہہ جگہہ
الجھا مری نگاہ کا دامن جگہہ جگہہ

رکھنا قدم سنبھال کے اے قاصدِ بہار
ٹوٹی ہوئی ہے شاخِ نشیمن جگہہ جگہہ

شمع و چراغ دے نہ سکے ساتھ وقت کا
جلتا رہا بس اک دلِ روشن جگہہ جگہہ

پھینکا نہ ایک تے بھی کوئی پھول اِس طرف
پھیلا مرا بہار میں دامن جگہہ جگہہ

سارا زمانہ گوش بر آواز ہے علیؔ
کام آئی میرے قلب کی دھڑکن جگہہ جگہہ



انگڑائی کے جال تن رہے ہیں
لمحات شراب بن رہے ہیں

تنہائیو یوں ہنسو نہ ہم پر
ہم بھی کبھی انجمن رہے ہیں

جلوے جو سمٹ کے رہ گئے تھے
آنچل کی تہوں سے چھن رہے ہیں

ہم سے ہیں لطافتیں عبارت
ہم آبروِ چمن رہے ہیں

افسانہ تو ایک ہی ہے لیکن
عنوان ہزار بن رہے ہیں

پھولوں کی نفیس سیج پر بھی
مجروح بدن بدن رہے ہیں

سستا ہے عسلی لہو ہمارا
ہم لوگ شہید فن رہے ہیں



روز اک غم سے ملاقات ہوئی جاتی ہے
خوب زخموں کی مدارت ہوئی جاتی ہے

جو نہ کہنا تھا وہی کہہ گئیں میری آنکھیں
جو نہ ہونی تھی وہی بات ہوئی جاتی ہے

کیا قیامت ہے کہ رودادِ ہمارے غم کی
شاملِ حرف و حکایات ہوئی جاتی ہے

ایک کا بھی نہ ملا آج تلک کوئی جواب
زندگی نذرِ سوالات ہوئی جاتی ہے

پھر ترے شہر کی جانب ہی قدم اٹھتے ہیں
پھر وہی صورتِ حالات ہوئی جاتی ہے

وہ جہاں ہیں وہیں پھوٹی ہے اجالے کی کرن
جس جگہہ ہم ہیں وہیں رات ہوئی جاتی ہے

روشنی دی تھی علی جس نے زبان و فن کو
گل وہی شمعِ روایات ہوئی جاتی ہے

زندگی آج بعنوانِ دگر یاد آئی
شب کے اوراق جو الٹے تو سحر یاد آئی

شامِ غربت کا جو اترا ہوا چہرہ دیکھا
اپنے دامن پہ پڑی گردِ سفر یاد آئی

پھول مہکے تو کسی زخم کا آیا ہے خیال
جام چھلکے تو کوئی پیاسی نظر یاد آئی

گردشِ وقت نے چھوڑی نہ کوئی راہ ذرا
ہائے کس وقت تری راہگزر یاد آئی

لالہ و گل سے ہوا جب بھی تعارف اپنا
زندگی خار بکف خاک بسر یاد آئی

اے علی اسکے تعاقب میں اٹھی تھیں نظریں
دفعتاً اپنی ہمیں حدِ نظر یاد آئی



خشک ہونٹوں پہ کیا ہنسی آئی
رہگزاروں میں چاندنی آئی

بعد مدت کے آئی یاد تری
وہ بھی جیسے تھکی تھکی آئی

پھول کسکے بدن کا یہ مہکا
بو کدھر سے گناہ کی آئی

ہم صلیبوں کی سمت جاتے تھے
زندگی تو کہاں چلی آئی

میرے شعروں میں وہ بدن جھلکا
چھن کے لفظوں سے روشنی آئی

کتنے جی دھک سے ہو گئے ہیں علیؔ
میرے ہونٹوں پہ جب ہنسی آئی



اور چہرہ کوئی چہرے پہ لگایا جائے
اجنبی بن کے نئے شہر میں جایا جائے

آئیے پھر سے صلیبوں کو سجایا جائے
غرق گل میں نہیں خون میں نہایا جائے

آپ ہیں ساقیِ دوراں تو شکایت کیسی
جس قدر زہر پلاتا ہو پلایا جائے

شبنم و گل کی لطافت وہ بدن ہے لیکن
ہاتھ جل جائیں اگر ہاتھ لگایا جائے

زلف و رخسار تو مہکیں گے بہرحال علی
فکر کو خواہ کسی موڑ پہ لایا جائے



مے کے ۔ مینا کے ۔ جام کے رستے
یہ نہیں خاص و عام کے رستے

نقش پا آئینہ دکھاتے ہیں
ہیں یہ کس خوشخرام کے رستے

لذت کرب پوچھئے ہم سے
ہم نے دیکھے ہیں ذام کے رستے

شمعِ رخسار کوئی سلگا دے
دھندلے دھندلے ہیں شام کے رستے

تجھ سے بچ کر کوئی کہاں جائے
ہیں سبھی تیرے نام کے رستے

پستیوں کی طرف نگاہ نہ کر
دیکھ بالائے بام کے رستے

مجکو پہنچا گئے مرے گھر تک
آپ سے انتقام کے رستے

کس دوراہے پہ مجکو لائے علیؔ
یہ حلال و حرام کے رستے



خوشی کی دھوپ تبسم کی چاندنی نہ ملی
حیات کیسی ہمیں اس کی گرد بھی نہ ملی

ہجومِ گل ہوا اتنا کہ رک گئیں سانسیں
جلے چراغ کچھ اتنے کہ روشنی نہ ملی

جو پی کے مست تھے برسے انھیں پہ میخانے
جو تشنہ لب تھے انہیں ایک بوند بھی نہ ملی

لگی رہی مرے قدموں کے ساتھ وقت کی دھوپ
کہاں کی زلف صلیبوں کی چھاؤں بھی نہ ملی

تمہارا ساتھ جہاں تک رہا غنیمت تھا
پھر اس مقام پہ عمرِ رواں کبھی نہ ملی

نہ جانے لوگ کہاں سمیٹ لاتے ہیں
ہمیں تو ایک تبسم کی بھیک بھی نہ ملی

وہ بار ہا مرے دل کے قریب سے گزرے
مگر کچھ ایسے کہ قدموں کی چاپ بھی نہ ملی

چراغ لیکے بہت ہم نے اے علی ڈھونڈا
کسی مقام پہ بھی ہمکو روشنی نہ ملی



تم اہلِ ظرف ہو پہلے یہ فیصلہ تو کرو
نظر اٹھاؤ تجلّی کا سامنا تو کرو

حیات سایہ ہی سایہ نہیں ہے دھوپ بھی ہے
غموں کے ساتھ بھی کچھ دور تک چلا تو کرو

میں ظلمتوں سے اجالے نچوڑ لاؤں گا
تم اپنی زلف مرے بازوؤں پہ وا تو کرو

ہزار چہرے تمہیں آئینہ دکھائیں گے
شکست اپنی انا کا تم آئینا تو کرو

زمیں پہ چاند ستارے بکھیرنے والو
ہمارے گھر میں بھی روشن کوئی دیا تو کرو

تمہیں نظامِ چمن کو اگر بدلنا ہے
گلوں سے رائے لو کانٹوں سے مشورہ تو کرو

علیؔ غزل کی روایت کا احترام بجا
مگر غزل کو نیا پیرہن عطا تو کرو

•

سامنے آ کبھی اے جانِ غزل
حرف و الفاظ کے پردوں سے نکل

•



پردۂ وقت بدلتا رہا منظر کتنے
لٹ گئے سامنے آنکھوں کے بھرے گھر کتنے

میکدے تو بہت آباد نظر آتے ہیں
لیکن ان میں ہیں مرے نام کے ساغر کتنے

یہ بھی دیکھو تو ذرا باغ لٹانے والو
ساتھ پھولوں کے چلے آئے ہیں پتھر کتنے

کیا خبر تھی کہ شراروں میں تلے گی شبنم
داد مانگی تو ملے طنز کے نشتر کتنے

اپنی تاریخ کے ہم آپ مورخ ہیں علیؔ
دیکھو رکھے ہیں قلم خون میں ڈبو کر کتنے

زیست دار و رسن تک آ پہنچی
تیغ کے بانکپن تک آ پہنچی

ذکر پھولوں کا جب کبھی نکلا
بات اُس کے بدن تک آ پہنچی

بات جو آ سکی نہ ہونٹوں تک
بات وہ انجمن تک آ پہنچی

وقت کی گرد میرے دامن سے
آپ کے پیرہن تک آ پہنچی

ذکر جب بھی چھڑا غزل کا علیؔ
بات میرے سخن تک آ پہنچی

تیرگی لی ہے روشنی دی ہے
ہم نے دنیا کو زندگی دی ہے

کون اس تشنگی کو چھلکائے
میکدوں نے جو تشنگی دی ہے

مجکو بخشے ہر ایک نے آنسو
میں نے ہر ایک کو ہنسی دی ہے

تیرے گھر میں رہے اجالا کیوں
تو نے جب مجکو تیرگی دی ہے

آبرو بیچ کر علیؔ ہم نے
چار دن کی ہنسی خریدی ہے

دن ہے وہی سورج ہے وہی صبح وہی ہے
سب کچھ ہے فقط ایک اجالے کی کمی ہے

بھر لائی ہے دامن میں ستاروں کے تراشے
وہ ایک کرن جو ترے آنچل سے چھنی ہے

زنجیر جو تھی پاؤں میں وہ کٹ گئی لیکن
حالات کی زنجیر تو پاؤں میں پڑی ہے

ہنستے ہوئے ہونٹوں پہ نہیں ہیں مری نظریں
پڑھتا ہوں وہ تحریر جو چہروں پہ لکھی ہے

باتیں تو علیؔ اور بھی کہنے کی ہیں لیکن
خاموش رہو مصلحتِ وقت یہی ہے

قطعات

رباعی

رنگوں کی طرح نکھر گئی ہے دنیا
پھولوں کی طرح سنور گئی ہے دنیا
کس نے یہ مرے دوش پہ کھولیں زلفیں
خوشبو کی طرح بکھر گئی ہے دنیا



ہم سے پوچھو جو پیار کرتے ہیں

کتنے مشکل ہیں پیار کے رستے

اپنی پلکوں سے ہم نے جھاڑے ہیں

مدتوں انتظار کے رستے



دل کا آئینہ اک تماشا ہے

جس کو کوئی سمجھ نہیں پاتا

اس میں سب کچھ نظر تو آتا ہے

اپنا چہرہ نظر نہیں آتا



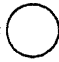
یاد اب بھی جو بدن کی تیرے
رات کے وقت کبھی آتی ہے
ایک مانوس سی خوشبو جیسے
میرے کمرے میں چلی آتی ہے



یہ اجالا کہاں سے پھوٹا ہے
جو اندھیرے کا رخ سنوار چلا
دل کی حسرت کوئی سلگ اٹھی
یا کہیں شام کا چراغ جلا



دوست دشمن میں فرق کیا کرتے
ہر قدم پر ہزار تھے دھوکے
دیکھنے پر بھی کچھ نہیں دیکھا
ایک چہرے پہ تھے کئی چہرے



یوں فریب آپ کو کب تک دو گی
نام میرا نہ کہاں تک لو گی
اپنی یادوں کے ورق الٹو تو
میری تصویر کہیں تو ہو گی



ظلمتیں جس قدر جوان ہوئیں
اور بھی کچھ سنور گئے تارے
بھیگی راتوں کی اوس پی پی کر
بن گئے کتنے پھول انگارے



لوٹ کر وقت لے گیا سب کچھ
میکدہ ہے نہ کوئی ساقی ہے
جل کے یادوں کو ہو گئی مدت
اب تو یادوں کی راکھ باقی ہے



آہ پوچھو نہ انتظار کی بات
شمع کے ساتھ جل رہا ہوں میں
ایک ویراں طویل رستے پر
جیسے مدت سے چل رہا ہوں میں



اتنے دھوکے دیے ہیں صبحوں نے
لوگ اب روشنی سے ڈرتے ہیں
منھ بہاروں کا چومنے والے
آج اک اک کلی سے ڈرتے ہیں



یوں تو راتیں ہزار دیکھی ہیں
کالی زلفوں کی رات ہے کچھ اور
یہ مہکتے ہوئے گھنے سایے
ان اندھیروں کی بات ہے کچھ اور



حادثے جب شور کر کے تھم گئے
زخم دل کا اور کچھ تازہ ہوا
اے علیؔ طوفاں گزر جانے کے بعد
اپنی بربادی کا اندازہ ہوا



میں ہوں کیا چیز اور کیا ہستی مری
دیکھئے دھوکا نہ کھا جائے نظر
میں بجائے خود نہیں ہوں روشنی
کر رہا ہوں مشعلیں لیکر سفر



دیکھنے کی ہے اب ضرورت کیا
ہر ادا اس کی دلنشیں ہو گی
ظاہر آواز کی مٹھاس سے ہے
وہ یقیناً بہت حسین ہو گی



زندگی کو مری نکھار گئے
غم کے طوفان درد کے دھارے
اشک آنکھوں سے جب کبھی ٹپکے
ڈھل گئے راستوں کے اندھیارے



دوش پر میرے بال کھول بھی دو
کب تلک کوئی اس طرح ترسے
کہیں ایسا نہ ہو کہ اب کے بھی
لوٹ جائے گھٹا یہ بِن برسے



خود فریبی سے فائدہ کیا ہے
اس طرح دور غم نہیں ہوتے
اے علیؔ آنکھیں موند لینے سے
کچھ اندھیرے تو کم نہیں ہوتے



کانچ کے دیوار و در میں بیٹھ کر
گھر کسی کا کیا اجاڑا جائے گا
آپ پتھر ہاتھ سے رکھ دیجئے
آپ سے پتھر نہ مارا جائے گا



کیا ضرورت ہے کہ میں آنکھ اٹھا کر دیکھوں
ہر ادا سے تجھے پہچان لیا کرتا ہوں
تو ہزار آئے دبے پاؤں مرے دل کے قریب
تیری خوشبو سے تجھے جان لیا کرتا ہوں



اتنی تنہا تو نہ تھی تنہائی
کوئی سب لوٹ گیا ہو جیسے
حال اب یہ ہے تمہید ہستی کا
ہاتھ وہ چھوٹ گیا ہو جیسے



تیرے پیار کی بھیگی رت میں
مہکے ہے یوں دل کا آنگن
بارش کے پہلے چھینٹوں میں
جیسے مٹی کا سوندھا پن

پڑتی ہے جس مقام پہ ہٹتی نہیں نظر
دلکش ہے دلنشین ہے جہاں سے تجھے پڑھوں
یہ شعریت۔ یہ طرز ادا۔ یہ شگفتگی
اے حسن کی کتاب کہاں سے تجھے پڑھوں



یہ بھی کیا کم ہے کہ دم بھر کیلئے
تیرگی تو رات کی کھو جائے گی
گھر مرا جلتا ہے جلجائے مگر
روشنی کچھ دیر تو ہو جائے گی